امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے تفسیری رجحانات

کا تقابلی مطالعہ

محمد سعود عالم قاسمی

امت مسلمہ کے مصلحین، مفکرین اور مجددین کی مختصر فہرست بھی مرتب کی جائے تو شیخ الاسلام علامہ تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ (ولادت ۶۶۱ھ وفات ۷۲۸ھ) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ولادت ۱۱۱۴ھ وفات ۱۱۷۶ھ) کا نام اس میں ضرور شامل ہوگا۔

یہ دو عبقری علما، اگرچہ دو مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے اور زمانی لحاظ سے بھی ان دونوں کے درمیان کم و بیش ساڑھے چار صدیوں کا فاصلہ ہے مگر زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود ان دونوں بزرگوں کے افکار و خیالات، علمی خدمات، اصلاحی جد وجہد اور کسی حد تک حالات و کوائف میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں علماء کی حیات و خدمات کا جائزہ لینے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یکساں کام اور یکساں انجام پسند فرمایا تھا۔ یہ دونوں حضرات اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے ایک ہی جذبہ سے بیتاب ہو کر اٹھے اور دونوں کو ایک ہی جیسی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، دونوں ہی تنگ نظر عالموں اور گمراہ صوفیوں کے تیر حسد کا نشانہ بنے اور دونوں کو حکام وقت کی طرف سے اذیتیں دی گئیں۔ اسلامی علوم و فنون پر دونوں کو عبور حاصل تھا اور دونوں کی خدمات اسلامی موضوعات پر گراں قدر ہیں۔ دونوں حضرات نے قرآن و سنت کو امت مسلمہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس بنانے پر زور دیا اور اس کے لئے فکری و عملی جد وجہد کی اور ان دونوں حضرات نے علماء کی ایسی جماعت تیار کی جو ان کے بعد منارہ نور اور مرجع خلائق ثابت ہوئی۔ علامہ ابن قیم الجوزیۃ، حافظ اسماعیل ابن کثیر، شمس الدین الذہبی، عبد الہادی اور ابو عبد اللہ ابن رشیق وغیرہم جیسے نابغہ روزگار اگر ابن تیمیہؒ

کے فیض یافتہ تھے تو شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، قاضی ثنا اللہ پانی پتیؒ، سید مرتضیٰ زبیدیؒ اور شاہ اہل اللہ پھلتی جیسے جید علما شاہ ولی اللہؒ کے تربیت یافتہ تھے۔

غرضیکہ دونوں اہل علم میں مماثلت و یکسانیت کے بہت سے پہلو موجود ہیں جن پر گفتگو کی ضرورت ہے مگر اس مماثلت کے باوجود بعض امور اور مسائل ایسے بھی ہیں جن پر دونوں کے خیالات اور فکری منہج میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ابن تیمیہؒ مروجہ تصوف کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں اور اسے دین میں بدعت شمار کرتے ہیں جب کہ شاہ ولی اللہ تصوف کے حامی ہی نہیں اس کے حامل بھی ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فرق پایا جاتا ہے جس کو نظر انداز کر کے دونوں کے انداز فکر سے صحیح واقفیت حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان میں ابن تیمیہؒ کا تعارف اس طرح نہیں ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے، یہاں کے علما، صوفیا، اور مشائخ کے درمیان ان کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں، بلکہ بہت سے دینی اور علمی حلقوں میں یہ غلط فہمیاں آج بھی موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض تنگ نظر اور شدت پسند عالموں نے ان کی تضلیل و تکفیر سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مرحوم صدر مدرس مولانا سید حسین احمد مدنی اپنے درس میں ابن تیمیہؒ کو گمراہ قرار دیا کرتے تھے اور مولانا شمس الدین افغانی (مسکونہ سورت گجرات) نے "الجواہر البہیہ فی شرح شرح عقائد نسفی" میں تقریباً تیس مقامات پر ابن تیمیہؒ کو الخبیث اللعین اور الملحد الزندیق جیسے نازیبا القاب سے نوازا ہے۔[1]

ابنِ تیمیہؒ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی نظر میں

شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی کے عہد یعنی بارہویں صدی ہجری میں بھی ابن تیمیہؒ کے متعلق عام ہندوستانی علما کی رائے کم و بیش یہی تھی، ان کی بعض توجیہات اور تفردات کی بنا پر ان کی دینی شخصیت اور اسلامی خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا اور ان کو گمراہوں کے طبقہ میں داخل کر دیا گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے ابن تیمیہؒ کے سلسلہ میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، علمی اور دینی نقطۂ نظر سے ان کا دفاع کیا اور

اسلام کے داعی و مبلغ اور متقی عالم کی حیثیت سے ان کا تعارف کرایا۔ چنانچہ شیخ معین الدین ٹھٹھوی نے جب شاہ ولی اللہ سے دریافت کیا کہ ابن تیمیہ کے سلسلہ میں کیا خیال اور عقیدہ رکھنا چاہیے، تو اس کے جواب میں شاہ صاحب نے تفصیل سے ابن تیمیہؒ کے علمی مقام، دینی خدمات اور شخصیت پر روشنی ڈالی اور ان پر کیے گئے اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔ انھوں نے لکھا کہ:

"وہ تمام علما، اسلام جو کتاب وسنت اور فقہ کے حاملین ہیں اور اہل سنت کی طرف سے دفاع اور اس کی حفاظت اور حمایت کرتے ہیں ان سب کے بارے میں خود میرا عقیدہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تمام مسلمان ان کے بارے میں یہی عقیدہ رکھیں کہ وہ سب عدول ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعدیل فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے کہ "ہر دور کے عادل لوگ اس دین کے حامل ہوں گے"، اگرچہ ان میں سے بعض ایسی چیزوں کے قائل ہوں جن سے اتفاق نہ ہو بشرطیکہ ان کا یہ قول نصوص کتاب وسنت اور اجماع امت کے خلاف نہ ہو اور اس کی احتمال ہی کے درجہ میں گنجائش ہو، پھر خواہ یہ قول اصول وعقائد کے باب میں ہو یا فقہی مباحث میں یا وجدانی حقائق کے سلسلہ میں۔ اسی بنیاد پر شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ مجدد احمد بن عبدالاحد سرہندی کے بارے میں ہم اس کے قائل ہیں کہ وہ اللہ کے مقبول بندوں میں سے ہیں اور ہم ان باتوں کی طرف مطلق التفات نہیں کرتے جو ان دونوں بزرگوں کے خلاف کہی جاتی ہیں چنانچہ یہی معاملہ ابن تیمیہؒ کا ہے ہمیں ان کا یہ حال بتحقیق معلوم ہے کہ وہ عالم کتاب اللہ تھے اس کے لغوی اور شرعی معانی پر ان کو عبور حاصل تھا۔ احادیث نبوی اور آثار سلف کے وہ حافظ تھے، مذہب حنابلہ اور اس کے اصول وفروع کے قلم کار تھے، بڑی طلاقت اور بلاغت کے ساتھ عقیدہ اہل سنت کی طرف سے دفاع کرتے تھے، فسق و بدعت کے قبیل کی کوئی بات بھی ان سے منقول نہیں، سوائے ان چند باتوں کے جن کی وجہ سے ان کو تنگ کیا گیا اور تکلیفیں

پہونچائی گئیں۔ اور ان میں کوئی ایک بات یا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لئے ان کے پاس کتاب وسنت اور آثار سلف میں سے کوئی دلیل نہ ہو۔ پس ابن تیمیہؒ جیسا کوئی آدمی پورے عالم میں ملنا مشکل ہے۔[۲]

ابن تیمیہؒ کا جو مقام اور مرتبہ شاہ ولی اللہؒ کے یہاں ہے وہ مذکورہ اقتباس سے بخوبی ظاہر ہے، بعض جزئیات میں علمی اختلاف کے باوجود شاہ صاحب ان کے قدر شناس اور مداح معلوم ہوتے ہیں خاص طور سے کتاب اللہ سے ان کی وابستگی اور اس کے لغوی وشرعی معانی کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں ذیل میں ہم ان دونوں بزرگوں کی قرآن فہمی، تفسیری مناہج اور قرآنی خدمات کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ابن تیمیہؒ کی قرآن فہمی

جہاں تک ابن تیمیہؒ کی قرآن فہمی کا تعلق ہے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز مدرس اور مفسر قرآن ہیں۔ ابن تیمیہؒ کا قرآنی ذوق ان کی محنت کے علاوہ آبائی ورثہ بھی تھا ان کے والد عبدالحلیم تیمیہؒ اپنے زمانہ کے نامور عالم دین اور مفسر قرآن تھے، وہ حران (شام) کی جامع مسجد میں ہر جمعہ کو قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے، ابن تیمیہؒ نے کم سنی میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا، پھر قرآن سے ان کو اتنا شغف ہو گیا کہ قرآن ان کے علمی مشاغل کا مرکز ومحور بن گیا بکثرت قرآنیات کا مطالعہ کیا بقول ان کے "تفسیر قرآن سے متعلق چھوٹی بڑی ایک سو سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا"[۳]

ان کے والد کا جب انتقال ہوا تو ابن تیمیہؒ کی عمر بائیس ۲۲ سال تھی انھوں نے درس قرآن کے پدرانہ سلسلہ کو برقرار رکھنے کے لئے ۱۰ صفر ۶۸۳ھ کو نماز جمعہ کے بعد دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تدریس وتفسیر شروع کی، یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ ابن تیمیہؒ کا درس قرآن کس قدر مدلل، مبسوط اور علمی ہوتا اور عوام اس سے کس قدر متاثر ہوتے اس کا اندازہ مشہور مفسر قرآن علامہ حافظ اسماعیل ابن کثیرؒ کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

کان یجتمع عندہ الخلق الکثیر   وہ اپنے درس میں دیانت اور زہد وبندگی

والجمع الغفیر ما کان یورد من العلوم	کے ساتھ جو متنوع علوم پر روشنی ڈالتے
المتنوعہ المحررۃ مع الدیانۃ	اس کی وجہ سے ان کے پاس مخلوق کا
والذھادۃ والعبادۃ صارت	جم غفیر جمع ہو جاتا تھا اور تمام دنیا کے
بذکرہ الرکبان فی سائر الاقالیم	قافلوں میں اس کا چرچا تھا
والبلدان علی ذالک مدۃ سنین	یہ سلسلہ طویل مدت تک جاری رہا۔
مطاولۃ[۲۰]	

ابنِ تیمیہؒ قرآن کریم کے الفاظ و معانی پر دسترس حاصل کرنے اور اس کے مفاہیم و مطالب کو حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور جانفشانی کرتے تھے، اس تحصیل قرآن کی طرف ابن تیمیہ نے بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:

ربما طالعت علی الآیۃ الواحدۃ	بسا اوقات میں ایک آیت کے
نحو مائۃ تفسیر ثم اسال	لئے تقریبًا ایک سو تفسیروں کا مطالعہ
اللہ الفہم و اقول یا معلم	کرتا پھر اللہ سے فہم قرآن کی دعا کرتا اور
ابراھیم علمنی وکنت	کہتا اے ابراہیمؑ کے معلم مجھے بھی علم
اذھب الی المساجد المھجورۃ	عطا کر، میں ویران مسجدوں اور ان
ونحوھا وامرغ وجھی فی	جیسے دیگر مقامات میں جاتا اور اپنا
التراب واسال اللہ تعالیٰ و	چہرہ خاک میں رگڑتا اور اللہ تعالیٰ سے
اقول یا معلم ابراھیم فھمنی[۲۱]	دعا کرتا اور کہتا اے ابراہیم کے معلم مجھے
	بھی قرآن کا فہم عطا کر۔

قرآن فہمی کے لئے ابن تیمیہ کا یہ جذبہ بیتاب جو کبھی ان کو غیر آباد مسجدوں میں لے جاتا ہے اور کبھی خاک میں اپنا چہرہ رگڑنے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی دست بستہ اللہ کے حضور میں لا کھڑا کرتا ہے دراصل قرآن سے والہانہ وابستگی اور قرآنی مطالب سے قلبی لگاؤ کا ثبوت مہیا کرتا ہے اور ابن تیمیہؒ کی شخصیت کو مستند اور معتبر بنا دیتا ہے

خصوصیت کے ساتھ اپنی آخری اسیری میں جو ان کی وفات پر منتہی ہوئی۔ قرآن کی تلاوت

اور تدبر معانی میں وہ منہمک رہتے۔ کیونکہ قرآن ہی قید و بند کی تنہائی میں ان کا رفیق اور وحشتِ غم کا انیس تھا وہ خود ہی کہتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے اس قید میں مجھ پر قرآن کے بہت سے وہ معانی اور اصولِ علم منکشف کر دیے جن کی بہت سے علماء آرزو کیا کرتے تھے، اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے زندگی کا بیشتر وقت غیر معانی قرآن میں کیوں صرف کر دیا۔"

قرآن ابن تیمیہؒ کی علمی زندگی کا میزان تھا اور سماجی زندگی کی شناخت بن چکا تھا چنانچہ جب ابن تیمیہؒ کا انتقال ہوا تو نمازِ جنازہ کے لئے یہ صدا دے کر لوگوں کو بلایا گیا "الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن" علامہ اقبال کی زبان میں ان کا مقام یہ تھا:

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

ابن تیمیہؒ کا قرآن سے والہانہ لگاؤ اور جذبہ صادق ان کی تفسیر میں بھی پنہاں محسوس ہوتا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری کے دل میں علم و معرفت کی چنگاری بھی سلگتی ہے اور داعیانہ جوش و امنگ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تفسیری جدوجہد کا اہل علم کے نزدیک کتنا وزن اور مقام ہے اسے ابوزہرہ کی زبانی سنیے:

فاما الذی اثر عنہ نماذج	قرآن کی جو تفسیر ابن تیمیہؒ سے منقول
جیدۃ للتفسیر السلفی قد اختلط	ہے وہ تفسیر سلفی کا عمدہ نمونہ ہے جس
بعمق النظر وسلامۃ الذوق	میں نظر کی گہرائی اور ذوق کی سلامتی
من غیر ان یطغی النظر علی الاثر	بھی شامل ہے، بغیر اس کے کہ نظر آثار
ولا ان یختفی الفکر المستقیم	پر دھوکہ کھا جائے اور فکر مستقیم
بین مختلف الروایات وشتی	مختلف نقول اور روایات میں گم ہو جائے
النقول بل انک لتری عقلہ	بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ان کی متفکر اور
المتفکر المتدبر یلمح وراء الروایات	مدبر عقل آثار و روایات کے پیچھے جھلکتی
فی مزدحم الاثار ومن ذالک	نظر آتی ہے ان کی ماثور تفسیروں میں

الماثور الذی نقرءہ تفسیر سورۃ	جن کو ہم پڑھتے ہیں سورۃ الصمد،
الصمد و تفسیر المعوذتین و تفسیر	معوذتین اور سورۃ النور کی تفسیر ہے۔
سورۃ النور ^۵۷	

شیخ ابوزہرہ کے تجزیہ سے ہر وہ شخص اتفاق کرے گا جس نے ابن تیمیہؒ کی تفسیر کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا ہو، ابن تیمیہ کا ذہن رسا بظاہر سادہ سی آیت سے ایسے معانی و مطالب کا سراغ لگا لیتا ہے جس کی طرف عام طور پر مفسروں کا ذہن نہیں جاتا اور قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ روایات و آثار سے بھی رشتہ برابر قائم کئے رہتا ہے۔ علامہ شمس الدین الذہبیؒ ابن تیمیہؒ کی قرآنی فکر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

برع فی تفسیر القرآن وغاص	تفسیر قرآن میں امتیاز حاصل کیا اور
فی دقیق معانیہ بطبع سیال	اس کے معانی کی باریکیوں میں ڈوب
وخاطر الی مواقع الاشکال	کر غور کیا اپنی رواں طبیعت کے ذریعہ
واستنبط منہ اشیاء	اور اعتراض کے مقامات پر توجہ دی اور
لم یسبق الیھا ^۵۸	اس سے ایسی چیزیں مستنبط کیں جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کی تھی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ابن تیمیہؒ کی تفسیر کی بڑی خصوصیت یہ لکھی ہے کہ اس کا زندگی سے ربط ہے، مصنف آیاتِ الٰہی کو اپنی گردوپیش کی زندگی اور اپنے معاصر انسانوں پر پیش کرتا ہے اور ان آیات کے نقطۂ نظر سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے ہم عصروں اور امت کے مختلف طبقوں کا احتساب کرتا ہے وہ بتاتا ہے کہ ان آیات و حقائق سے زندگی میں کہاں انحراف ہو رہا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں ^۵۹

ابنِ تیمیہؒ کا تفسیری سرمایہ

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابن تیمیہؒ نے قرآن مجید کی مکمل تفسیر لکھی تھی جو اب دستیاب نہیں ہے چنانچہ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ ابن تیمیہؒ نے چالیس جلدوں میں قرآن کی مکمل تفسیر لکھی

ہے اور یہی رائے، مشہور مستشرق بروکلمان کی بھی ہے[10] مگر یہ خیال غلط ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ ابوحیان اندلسیؒ کو ابن تیمیہؒ سمجھ لیا گیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ابن تیمیہؒ کی تیس جلدوں پر مشتمل تفسیر کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ضائع ہونے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔[11] مگر یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے، کیونکہ ابن تیمیہؒ نے صرف اپنی یادداشت کے لئے مفسرین سلف کے اقوال کو تیس جلدوں میں جمع کیا تھا۔[12]

واقعہ یہ ہے کہ ابن تیمیہؒ نے قرآن کریم کی مکمل تفسیر نہیں لکھی اور وہ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے، کیونکہ ان کے سامنے بہت سی طویل اور مختصر تفسیریں موجود تھیں۔ البتہ ان تفسیروں میں وہ بعض خامیاں محسوس کرتے تھے جن کی تلافی ان کی نظر میں ناگزیر تھی۔ اسی نقطہ نظر سے انھوں نے بعض سورتوں اور آیتوں کی تفسیر لکھی۔ ابن تیمیہؒ کے شاگرد ابوعبداللہ ابن رشیق نے سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے قرآن کی مکمل تفسیر لکھنے کی درخواست کی تو ابن تیمیہؒ نے حسب ذیل جواب دیا:

"قرآن کا کچھ حصہ بجائے خود واضح ہے کچھ حصہ کی مفسرین نے ایک سے زیادہ کتابوں میں تفسیر کی ہے لیکن بعض آیات ایسی ہیں کہ ان کی تفسیر علما کی ایک بڑی جماعت پر مشکل ہو گئی ہے ان کی گرہ کشائی کے لئے ایک شخص بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے پھر بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مصنف ایک آیت کی تفسیر کرتا ہے اسی طرح دوسری آیات کی بھی تفسیر ہونی چاہیے۔ میں نے دلیل کی روشنی میں انہی آیات کی تفسیر کا ارادہ کیا ہے کیونکہ جب ایک آیت کے معنی ظاہر ہو گئے تو اس طرح کی دوسری آیات کے معنی بھی ظاہر ہو جائیں گے۔"[13]

آخری اسیری کے ایام میں ابن تیمیہ کو قرآن سے لگاؤ زیادہ ہو گیا تھا، انھوں نے قید خانہ میں قرآنی کی تفسیر سے متعلق بہت کچھ لکھا یہ کل چودہ بستہ تھا، یہاں تک کہ بعض نزاعی مسائل میں حکومت وقت کی مداخلت کے سبب ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیا گیا تو انھوں نے کوئلہ سے بچے کھچے اوراق پر لکھنا شروع کیا، ان کے شاگردوں کو ابن تیمیہؒ کی تحریر زنداں کچھ تو ان کی حیات ہی میں مل گئی اور کچھ ان کی وفات کے بعد حکام وقت سے ملی[14] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہؒ کا کل تفسیری سرمایہ چونکہ عوام تک نہیں منتقل ہو سکا اس لئے ان کے جملہ تفسیری افکار سے خلق کو استفادہ کا

موقع نہ ملا پھر بھی ان کے شاگردوں نے ان کے آثار کو جمع کرنے میں بڑی دل چسپی لی اوران کے رسائل کی فہرست تیار کی، ان کے مشہور شاگرد علامہ ابن قیم الجوزیہؒ نے جو فہرست تیار کی ہے اس میں انھوں نے تفسیر سے متعلق چھوٹی بڑی بانوے [92] کتابوں اور رسالوں کا تذکرہ کیا ہے[15]

ابنِ تیمیہؒ کا طریقہ تفسیر

ابنِ تیمیہؒ نے سورتوں اورآیتوں کی تفسیر میں جو نہج اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے وہ آیت کی تفسیر میں مفسرین سلف کے اقوال نقل کرتے ہیں اوران اقوال کی روشنی میں اپنی بات کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ نے اقوال سلف کو جمع کرنے کا اہتمام ذاتی استفادہ کے لئے کیا تھا اوراسے اپنے تفسیری منہاج کا حصہ بنالیا تھا جیسا کہ ابوزہرہ کہتے ہیں:

"انھوں نے قرآن کریم کے تفسیری اقوال کو اس لئے جمع کیا تھا کہ ان کی تفسیر کے مواد میں کام آئے پھر انھوں نے ان اقوال کی روشنی میں تفسیر کا آغاز کیا"[16]

ابن تیمیہؒ اقوال سلف سے مدد لینے کے ساتھ ان مفسرین کا تعاقب کرتے ہیں اوران کی دلیل کی کمزوری واضح کرتے ہیں جو کسی بھی وجہ سے آیات کی سلفی تعبیر چھوڑ کر من مانی تفسیر کرتے ہیں، اسی لئے ان کی تفسیر میں جابجا جہمیہ، قدریہ، معتزلہ، شیعہ اور دیگر قوموں سے تعارض بھی ملتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی قرآن فہمی

جہاں تک شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی قرآنی فکر وبصیرت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ اپنے عہد کے علماء میں ممتاز اور فائق نظر آتے ہیں۔ سات سال کی عمر میں انھوں نے قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔ یہاں سے ان کو قرآن سے مناسبت پیدا ہوئی پھر مطالعہ تفسیر اورقرآن کے الفاظ ومعانی پر غور وتدبر اور درس وتدریس نے ان کی قرآن فہمی کو جلا بخشی تا آنکہ انھوں نے عوامی تعلیم اوراصلاح کے لئے قرآن کو بنیاد بناکر کام شروع کیا۔ شاہ صاحب کی قرآنی بصیرت ان کتابوں سے عیاں ہے جنھیں قرآنی موضوعات پر انھوں نے سپرد قلم کیا ہے مثلاً فتح الرحمٰن

قرآنِ کریم کا فارسی ترجمہ مع مختصر حواشی، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، المقدمہ فی قوانین الترجمہ، فتح الخبیر بمالا بد حفظہ فی علم التفسیر اور تاویل الاحادیث۔ ان کے علاوہ ان کی دیگر دینی کتابوں میں قرآنی بصیرت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شاہ صاحب اپنے قرآنی فہم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الحمد للہ اس فقیر کو تمام فنون تفسیر میں خاص مناسبت حاصل ہے اور علوم تفسیر کے اکثر اصول اور اس کے فروع کی ایک معقول مقدار معلوم ہے اور اس کے ہر فن میں اجتہاد فی المذہب کے قریب قریب تحقیق و استقلال حاصل ہوگیا ہے۔ ان کے علاوہ فنون تفسیر کے دو تین اور بھی فن فیض الٰہی کے بحرِ بیکراں سے القا ہوئے ہیں اگر سچ پوچھو تو میں قرآن مجید کا بلا واسطہ ایسا ہی شاگرد ہوں جیسا کہ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا۔"[۱۱]

شاہ ولی اللہؒ کے دینی، سماجی، معاشی اور سیاسی نظریات کی اساس قرآن ہے اور وہ اس کو امت مسلمہ کی اجتماعی سرگرمیوں میں اور انفرادی کردار میں جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں انھوں نے امرا، سپاہی، صنعت و حرفت سے وابستہ اور ملازم سبھی طبقات اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قرآن کو نسخہ کیمیا بنا کر پیش کیا ہے اور دوسری طرف اصحاب علم و دانش کو فقہی جزئیات، منطقی موشگافیوں اور لایعنی بحثوں سے بچا کر قرآنی علوم و فنون کی اشاعت اور اس سے وابستگی پر آمادہ کرنے کی سعی کی ہے۔ مسلم معاشرے میں قرآن کریم کو جو صحیح مقام ملنا چاہیئے اس کی عملی جدوجہد شاہ صاحب نے کی اور اس جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ قرآن کے فہم معانی کی تحریک چل پڑی۔ درس قرآن کے حلقے وجود میں آئے، قرآن کے بکثرت ترجمے ہوئے اور درسیات میں تفسیر و اصول تفسیر کو خاص مقام دیا جانے لگا۔ مولانا عبیداللہ سندھی شاہ صاحبؒ کے اس کارنامہ پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

"قرآن مجید کو اس شکل میں کہ صرف وہی دین اسلام کا اساسی قانون ہے اور اسی پر دین کا تمام تر انحصار ہے اور سنت یعنی اسلام کے دور اول کا اجماع اور فقہ یعنی مابعد میں اس دور کے اتباع بالاحسان کرنے والوں کا اجماع یہ سب کے سب قرآن کے اساسی قانون کے "بائی لاز" اور تشریحی بائی لاز ہیں۔ امام ولی اللہ دہلوی کی وہ شخصیت ہے جس نے قرآن کو اس شکل میں مسلمانوں سے متعارف

کرایا۔[۱۵]

شاہ ولی اللہؒ کا طریقۂ تفسیر

شاہ صاحبؒ نے فتح الرحمٰن میں صرف ترجمہ اور مختصر حواشی پر اکتفا کیا ہے تاکہ عام لوگ تفسیری بحثوں میں الجھنے کے بجائے قرآن پر اپنی توجہ مرتکز کر سکیں۔ ترجمہ کے لئے انھوں نے لفظی اور تعبیراتی دونوں کے درمیان کی راہ اختیار کی ہے۔ جب کہ قرآن کے اصول پنجگانہ یعنی علم الاحکام، علم المخاصمہ، علم التذکیر بآلاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت و ما بعد، کو الفوز الکبیر میں سمجھانے کی سعی کی گئی ہے، اسی کے ساتھ ان ضروری علوم پر بھی گفتگو کی گئی ہے جن کا جاننا قرآن کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ تاویل الاحادیث اور الخیر الکثیر جیسی کتابوں میں قرآن کی فلسفیانہ سطح کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے، گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے تفسیری منہج کے دو پہلو ہیں ایک عمومی ہدایت اور دعوت کا دوسرا خصوصی معرفت اور تربیت ذہن کا۔ اگرچہ زور قرآن فہمی، قرآن سے وابستگی اور قرآن کی اشاعت پر ہے[۱۶] شاہ صاحبؒ کے صاحبزادگان شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن کے جو اردو ترجمے کئے ان کو شاہ صاحبؒ کی تحریک قرآن کا ہی حصہ سمجھنا چاہئے۔

قرآن فہمی ابن تیمیہؒ اور شاہ صاحبؒ کی نظر میں

شاہ صاحب نے بارہویں صدی میں جس علمی جمود اور قرآن سے محض رسمی تعلق کا مشاہدہ کیا اور اس کو دور کرنے کے لئے قرآن کو نسخۂ شفا بنا کر پیش کیا اس کا پورا پورا عکس ہمیں ساتویں صدی میں ابن تیمیہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عہد کے اس رجحان کی شدت سے تردید کرتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت کر لینا کافی ہے اور فہم معانی کی طرف سے چشم پوشی قابل مؤاخذہ نہیں۔ ابن تیمیہ نے بجا طور پر یہ احساس دلایا کہ قرآن کا مقصد اصلی فہم معانی ہے اور اسی پر ہدایت کا انحصار ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

> "یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ہر کلام کا مقصد اس کے معانی کو سمجھنا ہے نہ کہ صرف الفاظ۔ قرآن اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کے معانی کو سمجھا جائے، چونکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم علم و فن مثلاً طب اور حساب کی کوئی کتاب پڑھے

اور اس کے معانی کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو یہ معاملہ صرف کلام اللہ کے ساتھ کیوں ہے جب کہ وہ لوگوں کی عصمت ہے اور اسی سے لوگوں کی سعادت اور نجات وابستہ ہے اور اسی پر ان کے دین و دنیا کا انحصار ہے۔"[۱۲۰]

پانچ صدیوں بعد شاہ ولی اللہ نے بھی مسلمان قوم کے اسی مرض کی تشخیص کی اور وہی علاج تجویز کیا جو ابن تیمیہؒ نے کیا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

"یاران سعادت مند مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی، شیخ سعدی کی گلستاں شیخ فرید الدین عطار کی منطق الطیر فارابی کے قصے مولانا عبدالرحمٰن جامی کی نفحات الانس اور ان جیسی کتابیں مجلسوں میں بیان کرتے ہیں کیا اچھا ہوتا اگر اسی طرح اس ترجمہ قرآن کا مذاکرہ کریں اور اپنے دلوں کو اس کے ادراک میں مشغول رکھیں اگر وہ مشغولیت اولیا، اللہ کے کلام کے ساتھ ہے تو یہ شغل کلام اللہ کا ہے اگر وہ حکیموں کے مواعظ ہیں تو یہ احکم الحاکمین کا موعظ ہے۔ اگر وہ عزیزوں کے مکتوب ہیں تو یہ رب العزت کا مکتوب ہے۔ اگر انصاف سے کام لو تو نزول قرآن کا اصل مقصد اس کے الفاظ سے نصیحت حاصل کرنا اور اس کی ہدایت سے ہدایت یاب ہونا ہے صرف تلفظ مقصود نہیں اگرچہ وہ بھی غنیمت ہے، مسلمانوں نے یہ کیا شیوہ اپنا لیا ہے کہ قرآن کے معانی کو نہیں سمجھتے اور جو قرآن کے مدلول کو نہیں جانتا اسے کیا حلاوت نصیب ہوگی!"[۱۲۱]

غور کیا جائے کہ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے حالات اور خیالات میں کتنی قربت اور مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں فہم قرآن کو اساس حیات قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی پرجوش دعوت دیتے ہیں۔

تفسیری اصول

امام ابن تیمیہؒ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود قرآن سے اس کی تفسیر کی جائے کیونکہ ایک مضمون اگر ایک جگہ مجمل ہے تو دوسری جگہ مفصل۔ اس کے بعد سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ وہ قرآن کی شرح و تفسیر ہے۔۔۔

لیکن جب قرآن وسنت سے معنی معلوم نہ ہوں تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ نزول قرآن کے مشاہدہ اور ان مخصوص حالات کی معرفت کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ فہم کامل اور عمل صالح کے اہل تھے خصوصاً ان کے اکابر صحابہ جیسے خلفاء اربعہ اور ہدایت یاب ائمہ جیسے عبداللہ ابن مسعودؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ وغیرہ کہ وہ مطالب قرآن سب سے زیادہ جانتے تھے[۲۲]

ابن تیمیہ صحابہ وتابعین کی معروف تفسیر کے علاوہ تفسیر وتاویل کرنے والے کو کہتے ہیں کہ

مفتر علی اللہ، ملحد فی آیات اللہ	وہ اللہ پر بہتان باندھتا ہے۔ اس
محرف للکلم عن مواضعہ وھذا	کی آیات میں الحاد کرتا ہے اور تحریف
فتح لباب الزندقة[۲۳]	کرتا ہے اور یہ زندقیت کا باب کھولتا

ہے۔

اس سلسلہ میں ابن تیمیہؒ کا اصرار یہاں تک ہے کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ وتابعین کے دو مختلف اقوال ہوں تب بھی ان کے بعد والوں کے لئے تیسرا قول اختیار کرنے کی ضرورت نہیں مگر یہ ابن تیمیہؒ کا اپنا اجتہاد ہے۔ دوسرے مفسرین و محققین مثلاً ابوالحسن بصری، فخرالدین رازی، علامہ آمدی اور ابن حاجب وغیرہ اس کے برعکس کہتے ہیں کہ اس کی پوری گنجائش ہے"۔ ساتھ ہی ساتھ ابن تیمیہ تابعین کے انہی اقوال کو حجت مانتے ہیں جو متفق علیہ ہوں اختلاف کی صورت میں ایک کا قول دوسرے پر اور بعد والوں پر حجت نہیں مانتے، ایسی صورت میں وہ قرآن وحدیث کی زبان اور لغت عرب یا اقوال صحابہ سے مدد لینے کی تلقین کرتے ہیں[۲۴]

تاہم جس طرح وہ تفسیر بالرائے سے محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں اسی طرح لغت سے مفہوم نکالنے کے سلسلہ میں کافی فہم وبصیرت کا مطالبہ کرتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں تفسیری لغزش کی دو وجوہ ہیں:

> "ایک تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے پہلے سے اپنے عقیدے اور نظریے بنالیے پھر قرآنی الفاظ کو کھینچ تان کر ان پر منطبق کرنے لگے، دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کی تفسیر محض لغت عرب سے کی ہے اور اس کا لحاظ نہ کیا کہ متکلم کی مراد کیا ہے اور اس نے کیا مطلب بیان کیا جس پر قرآن نازل ہوا ہے اور وہ لوگ کیا سمجھتے تھے

جو قرآن کے اولین مخاطب تھے[25]

شاہ ولی اللہ اس اصولِ تفسیر سے نہ صرف اتفاق کرتے ہیں بلکہ اسی کی تلقین کرتے ہیں اگرچہ وہ اختلاف اقوال کی صورت میں ابن تیمیہؒ کی طرح پابند نظر نہیں آتے تاہم وہ مفسر کے لئے لازم سمجھتے ہیں کہ:

"عالم کو چاہئے کہ وہ آیات کے مفہوم کو تلاش کرے اور اسی کو اپنا مذہب قرار دے خواہ وہ اس کے سابق نظریہ کے موافق ہو یا مخالف، لیکن لغت قرآنی کو عرب اول کے استعمال سے اخذ کرنا چاہئے اور صحابہ و تابعین کے آثار پر پورے طور پر اعتماد کرنا چاہئے"[26]

اس اصول کی مزید وضاحت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح کی ہے:

"جو شخص قرآن کی زبان نہیں جانتا اور قرآنی الفاظ کی تشریح، سببِ نزول اور ناسخ و منسوخ سے متعلق احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے آثار سے واقف نہیں اس کے لئے قرآن کی تفسیر کرنا حرام ہے"[27]

قرآنی الفاظ کی تشریح و تفہیم کے لئے ابن تیمیہؒ نے آثار صحابہ بالخصوص عبداللہ ابن عباسؓ اور عبداللہ ابن مسعودؓ کی مرویات کو ترجیح دی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس سلسلہ میں صرف عبداللہ ابن عباسؓ کا تذکرہ کیا ہے، اور ان سے مروی متعدد طرق کا حوالہ دیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "قرآن کے نادر الفاظ کی تشریح کا بہترین طریقہ وہ صحیح روایات ہیں جو ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے بطریق ابن ابی طلحہ مروی ہیں امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس پر اعتماد کیا ہے پھر ابنِ عباسؓ کی بطریق ضحاک اور نافع بن ازرق کے سوالوں کا جواب جو عبداللہ ابن عباسؓ نے دیا ہے زیادہ بہتر ہیں سیوطی نے ان تینوں طریقوں کا تذکرہ الاتقان میں کیا ہے"[28]

تاویل کا مفہوم اور حدود

تفسیر ہی کی طرح تاویل بھی قرآن فہمی کے لئے ناگزیر ہے بلکہ یہ تفسیر ہی کا حصہ ہے ابن تیمیہؒ نے تاویل پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں معاصر علماء سے ان کے مناقشے بھی ہوئے ہیں ابن تیمیہؒ

تاویل کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ:

التاویل ھوما اول الیہ الکلام اویؤل الیہ اوتاول ھوالیہ والکلام انما یرجع ویعود ویستقر ویؤل الیٰ حقیقتہ التی ھی عین المقصود بہ کما ل قال بعض السلف[۲۹] یعنی کلام کو اس کی حقیقت کی طرف لوٹانا ہی تاویل کا صحیح مفہوم ہے۔ ابن تیمیہؒ نے سلف اور متکلمین بالخصوص معتزلہ، فلاسفہ اور صوفیا کی تاویل میں فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ "اسلاف کے نزدیک تاویل قرآن وحدیث کی روشنی میں تفسیر اور بیان مراد کا نام ہے اور اسی معنی میں قرآن کے اندر یہ لفظ اکثر وارد ہوا ہے اور یہی تاویل مقبول بھی ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ قرآن کی اس تاویل کا علم رکھتے تھے جسے انھوں نے سمجھا اور بیان کیا اور اسی معنی میں حسن بصریؒ کا یہ قول ہے: "ما انزل اللہ اٰیۃ الا ھو یحب ان یعلم ما اراد بھا" اللہ نے جو بھی آیت نازل کی ہے اس کی مراد کو جاننا واجب ہے[۳۰]

ابن تیمیہؒ حسن بصریؒ کے اس قول کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ وہ قرآن کی کسی بھی آیت پر توقف کرنے اور اس کے معنی نہ بیان کرنے کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے سمجھنے اور اس میں غور کرنے کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بتایا ہے۔

جہاں تک تاویل کی دوسری قسم کا تعلق ہے جس کے قائل اکثر مسلمان فلاسفہ، متکلمین اور صوفیا ہیں اس کا مطلب ان کی خاص اصطلاح میں لفظ کو اس کے معنی مدلول سے جس پر مفہوم کا مدار ہے دوسرے ایسے معنی کی طرف پھیرنا ہے جو کہ پوشیدہ ہے۔ تاویل کی اس دوسری شکل پر ابن تیمیہؒ کا تبصرہ یہ ہے:

"تاویل کی یہ قسم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پوشیدہ نہ تھی کیونکہ آپ نے خود ایسے مقام پر جس میں ظاہری معنی کا چھوڑنا لازم ہے دوسرے معنی بیان فرمائے جو اس لفظ کا مفہوم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسے کلام میں گفتگو کریں گے جس کا مفہوم ومدلول باطل ہو اور مراد حق کے بیان کرنے سے اجتناب کریں گے اور نہ یہ ان کے لئے مناسب ہے کہ وہ لوگوں سے یہ چاہیں کہ وہ اس کے کلام کے معنی سمجھیں جب تک اسے ان کو نہ بتائیں اور

وضاحت نہ فرمائیں "[۳۱]

تاویل کی انواع اور ان کی تفصیلات پر ابن تیمیہؒ کے رسالۃ الاکلیل فی التشابہ و التاویل میں بحث موجود ہے[۳۲]۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک تاویل کا اصل محل انبیاء کے قصص ہیں اور اس کا مفہوم وہ یہ بیان کرتے ہیں:

تاویل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس زمانہ میں جو تدبیر چاہی اس کے لحاظ سے ہر اس قصہ کے لئے جو رونما ہوا پیغمبرؑ اور اس کی قوم کی استعداد میں سے ایک مبدأ ہو، گویا اسی معنی کی طرف آیت "وَيُعَلِّمُكُمْ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ" میں اشارہ کیا گیا ہے[۳۳]

شاہ صاحب نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ "تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء والرسل" کے نام سے رقم کیا ہے اس میں انھوں نے آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائی واقعات کی فلسفیانہ تاویل و توجیہ کی ہے، شاہ صاحب نے سورہ یوسف کی مذکورہ آیت کے مفہوم میں تعمیم اور توسیع کی ہے اور اسے وہبی علوم میں شمار کیا ہے جب کہ ابن تیمیہؒ کے نزدیک آیت کے لفظ تاویل کا مفہوم محض خواب کی تعبیر تک محدود ہے[۳۴] ابن تیمیہؒ جن چیزوں کو سلفی تعبیر سے مختلف پاکر رد کر دیتے ہیں شاہ صاحب وہاں بھی وسعت اور معنویت کی تلاش کرتے ہیں چنانچہ وہ مفسرین کے مختلف طبقات مثلاً محدثین، فقہا، متکلمین، نحویین، ادبا، قراء، اور اہلِ تصوف کے طریقہ تفسیر کے اختلاف کو فن تفسیر کی وسعت اور جامعیت پر محمول کرتے ہیں"[۳۵]

اسماء وصفات کی آیات کی تفسیر و تاویل میں امام غزالیؒ کا نقطۂ نظر ابن تیمیہؒ سے مختلف ہے اور وہ ابن تیمیہ کے مقابلہ میں زیادہ قابل فہم ہے اور دیگر مفسرین و محققین کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ بھی اور شاہ ولی اللہ بھی اس دوسرے نقطۂ نظر کے حامل ہیں جیسا کہ متشابہات کی بحث میں تذکرہ آئے گا مگر ابن تیمیہؒ امام غزالی سے اس سلسلہ میں اتفاق نہیں کرتے بلکہ اس پر تنقید کرتے ہیں۔[۳۶]

شان نزول

مطالعہ قرآن کی راہ میں اسباب نزول کی معرفت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس فن پر

سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ دونوں بزرگوں نے موقع بموقع اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فتح الخبیر کے نام سے الفوز الکبیر کا ایک ضمیمہ اس موضوع پر سپرد قلم کیا ہے۔ اسباب نزول کے سلسلہ میں دونوں بزرگوں کے خیالات میں یک گونہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے ابن تیمیہؒ کا خیال تو یہ ہے کہ جب کہا جائے کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ واقعہ اس آیت کا سببِ نزول ہے اور کبھی یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ واقعہ اس آیت میں داخل ہے اگرچہ اس کا سبب نزول نہیں ہے۔[۳۷]

شان نزول کی معرفت کے سلسلہ میں ابن تیمیہؒ کا یہ خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر سلف نے الگ الگ واقعات کو ایک ہی آیت کی شان نزول کہا ہے تو اس میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے یہ سب درست ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ آیت ان تمام واقعات کے بعد نازل ہوئی ہو اور ان تمام کو جامع ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہو ایک مرتبہ اس سبب کے نتیجہ میں اور دوسری مرتبہ دوسرے سبب کے نتیجہ میں۔ اس اختلاف کی وجوہ بھی ابن تیمیہ کی نظر میں ناگزیر ہیں وہ کہتے ہیں کہ تنوع تفسیر کے دونوں اصناف کبھی تو اسما، وصفات کے تنوع کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور کبھی مسمّٰی کے بعض پہلو کا ذکر کرنے کی وجہ سے جیساکہ تمثیلات میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں اصناف سلف کی تفسیروں میں غالب ہیں جو باہم مختلف سمجھے جاتے ہیں۔[۳۸]

شاہ ولی اللہ دہلوی بھی اسباب نزول میں تعمیم کے قائل ہیں اور وہ اسے اجتہادی بھی سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ اکثر فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں فلاں واقعہ میں نازل ہوئی مگر ان کا مقصود صرف آیت کے افراد اور مصداق کی تصویر کشی اور بعض ایسے مخصوص حادثات کا ذکر ہوتا ہے جن کو آیت اپنے عموم کی وجہ سے شامل ہے عام اس سے کہ وہ واقعہ جس کو انھوں نے سبب نزول کہا ہے آیت کے نزول سے مقدم ہو یا موخر، اسرائیلی ہو، جاہلی ہو یا اسلامی، آیت کے تمام قیود کو حاوی ہو یا بعض کو اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اجتہاد کو بھی سببِ نزول میں کچھ دخل ہے اور اسباب نزول میں متعدد قصوں کے ذکر کرنے کی گنجائش ہے۔[۳۹]

گویا اس بات پر دونوں متفق ہیں کہ کسی آیت یا سورہ کے سبب نزول کے لئے واقعہ کا

نزول آیت سے مقدم ہونا ضروری نہیں مگر ابن تیمیہ اس صورت میں آیت کے تعدد نزول کو خارج ازامکان نہیں سمجھتے جب کہ شاہ ولی اللہ اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے بلکہ وہ آیت کے عموم میں مقدم و موخر ہر قصہ کی گنجائش سمجھتے ہیں اور اسے اجتہادی بھی مانتے ہیں جن میں اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔

محکمات ومتشابہات

قرآن کریم سورہ آل عمران آیت ۶ میں بعض آیات کو محکم اور بعض کو متشابہ کہا گیا ہے

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ	وہی ہے جس نے تمہارے اوپر
الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ	کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰت	جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری
فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ	کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں
فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ	تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس
الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا	میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں
يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ	تاکہ فتنہ پیدا کریں اور انکی حقیقت و ماہیت معلوم
فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا كُلٌّ مِّنْ	کریں حالانکہ اسکی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں
عِنْدِ رَبِّنَا	جانتا تو جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں
	کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے رب کے
(آل عمران: ۶)	پاس سے ہے اور یاد دہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں

اس لئے محکم و متشابہ آیات کے تعیین و تفہیم کا مسئلہ بھی قرآن کے اہم مسائل میں سے ہے۔ مفسرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ متشابہ آیات کی مراد سے صرف اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے جب کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رسوخ فی العلم عطا کیا ہے وہ بھی اس کی مراد سے واقف ہیں۔ ابن تیمیہؒ کے نزدیک قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے معنی نہ سمجھے جا سکیں، وہ حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ”ما انزل اللّٰہ اٰیۃ اِلا وھو یحب ان یعلم فیما ذا انزلت وماذا عنی بہا وما استثنی من ذالک لامتشابہا ولا غیرہ“[۱۴]

اللہ تعالیٰ نے جو آیت بھی نازل کی ہے اس کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس چیز کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کی مراد کیا ہے اس سے متشابہ وغیرہ کا کوئی استثنا نہیں ہے۔ مگر چونکہ انسانی عقل وفہم کی سطح یکساں نہیں ہے بلکہ اس میں فرق ہے۔ اس لئے قرآنی مضامین کے فہم و تفقہ میں بھی مقام اور مراد کے لحاظ سے ساری باتیں ہر انسان پر ظاہر نہیں ہوتیں اس لئے ابن تیمیہؒ نے متشابہ کو "اضافی چیز" قرار دیا ہے یعنی جس سے راسخون فی العلم تو واقف ہیں مگر کمزور لوگوں پر وہ مشتبہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"متشابہات کے بارے میں دو قول ہیں ایک تو یہ کہ وہ آیات بجائے خود متشابہ ہیں جملہ انسانوں پر، اور دوسرا قول جو صحیح ہے وہ یہ ہے کہ متشابہ "امر نسبی" یعنی اضافی چیز ہے جو بعض پر متشابہ ہے اور بعض پر نہیں۔ لیکن محکم آیات کسی پر متشابہ نہیں اور متشابہات کے معنی اگر معلوم ہو جائیں تو وہ بھی غیر متشابہ ہو جاتی ہیں"[۱۴۱]

ابن تیمیہؒ کا نقطۂ نظر محکمات و متشابہات کے سلسلہ میں واضح اور دو ٹوک ہے اس نقطۂ نظر کی مزید وضاحت انھوں نے سورہ اخلاص کی تفسیر میں کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ پورا قرآن قابل فہم اور قابلِ غور ہے اور بہت سے اسلاف متشابہات کے مفہوم سے واقف تھے۔[۱۴۲]

علامہ رشید رضا مصریؒ ابن تیمیہؒ کے نقطہ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

عرفان و تحقیق کا منتہا ہے اور اس بیان کے بعد کوئی بیان نہیں جس میں ابن تیمیہؒ نے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں ایسا کوئی کلام نہیں ہے جس کے معنی نہ سمجھے جا سکیں اور یہ کہ متشابہ ایک اضافی چیز ہے جس میں کمزور تو مشتبہ ہو جاتا ہے مگر راسخ مشتبہ نہیں ہوتا۔ اور لایعلمہ الا اللہ کی تاویل یہ ہے کہ جس کی طرف وہ آیات فی الواقع تقاضا کرتی ہیں مثلاً صفات اللہ کی کیفیت، عالم غیب کی کیفیت اور جنت و جہنم کی کیفیت"[۱۴۳]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی کم و بیش اسی رجحان کے حامل نظر آتے ہیں یعنی وہ متشابہات کی تفہیم و تعیین کو ممکن تصور کرتے ہیں ان کے نزدیک متشابہات کا مطلب ہے "محتمل معانی باہم مشتبہ"[۱۴۴] گویا متشابہ ان کے نزدیک وہ کلام ہے جس میں چند معانی کا احتمال ہو اور وہ باہم متشابہ ہوں

الفوز الکبیر میں اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "متشابہ وہ کلام ہے جس میں دو معانی کا احتمال ہو یا توضیح کے دو مرجعوں کی جانب لوٹنے کا احتمال یا کلمہ کا دو معانی میں مشترک ہونے کا احتمال یا یہ کہ قریب و بعید دونوں پر عطف کا احتمال ہو یا عطف اور استیناف دونوں کا احتمال ہو"[۵]

شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی مزید وضاحت کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"محکم وہ ہے جو صرف ایک معنی (توجیہ) کا احتمال رکھتا ہو مثلاً حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ اور متشابہ وہ ہے جو متعدد معانی کا احتمال رکھتا ہو اور مراد اس میں سے بعض ہو مثلاً لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا کج فہموں نے اسے اباحتہ شرب خمر پر محمول کیا ہے جب تک کہ بغاوت اور فساد فی الارض نہ ہو اور صحیح یہ ہے شارب خمر پر اس کا محمول ہونا تحریم سے پہلے تھا"[۴۴]

متشابہات کے ضمن مین اللہ تعالی کے اسماء وصفات کی بحث بھی آئی ہے، ابن تیمیہؒ کے نزدیک قرآن کا کوئی حصہ ایسا متشابہ نہیں ہے جس کی تاویل نہ ہو اس لئے وہ صفات کی ان آیات کی بھی تاویل کرتے ہیں جو دوسرے مفسرین کے نزدیک متشابہ ہیں۔ مثلاً اللہ کے ہاتھ، چہرہ اور استوی علی العرش کا جو تذکرہ قرآن میں موجود ہے ابن تیمیہؒ نے اس کی تفسیر و تاویل کی ہے اور وہ محل نزاع بنی۔ شاہ ولی اللہؒ ابن تیمیہؒ کے برخلاف ایسے مقامات کو متشابہات میں شامل سمجھتے ہیں اور ان میں غور و خوض کے قائل نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "صفاتِ الٰہی کی حقیقت کے بیان میں اور متشابہات کی تاویل میں متکلمون نے جو غلو کیا ہے وہ میرا مذہب نہیں ہے، میرا مذہب مالک ثوری، ابن مبارک اور سارے قدماء کا ہے کہ وہ (صفات) متشابہات کے قبیل سے ہیں جن کی تاویل میں غور و خوض نہیں کرنا چاہیے"[۴۵]

نسخ کا مفہوم

نسخ کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی آیت یا کسی حکم کا ختم ہو جانا اور اس کی جگہ کسی دوسری آیت یا حکم کا نافذ ہو جانا۔ مگر نسخ کا مفہوم ابن تیمیہؒ اور شاہ صاحبؒ دونوں کے نزدیک

اس سے کہیں زیادہ وسیع اور جامع ہے چنانچہ ابن تیمیہؒ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نسخ اسلاف کی نظر میں اسم عام ہے ہر اس چیز کے لئے جو آیت کی دلالت معنی باطل کے لئے رفع کرتی ہو اگرچہ وہ معنی اس سے مراد نہ ہو اور نہ آیت کا ظاہری مفہوم اس پر دلالت کرتا ہو بلکہ اس کا مفہوم بھی نہ ہو، البتہ کچھ لوگوں نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے اور اپنے اس فہم کی بنا پر وہ آیت کے ابہام اور اس کی تعمیم کو رفع کرنے والی چیز کو نسخ کا نام دیتے ہیں"[۸]

شاہ ولی اللہؒ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

"اصولیین نے جس اصطلاح میں نسخ کا لفظ استعمال کیا ہے صحابہؓ اور تابعینؒ اس کے علاوہ معانی کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے تھے اور وہ لغوی معنی سے زیادہ قریب ہے یعنی "الازالہ" اس لئے ان کے نزدیک نسخ کے معنی تھے گذشتہ آیت کے بعض اوصاف کا بعد میں آنے والی آیت سے ازالہ کرنا، یا تو مدت عمل کے ختم ہو جانے کے باعث یا کلام کو معنی متبادر سے پھیر دینے کے باعث یا بعض قیود کے ذکر کر دینے کے باعث، اسی طرح عام کی تخصیص اور منصوص اور جس پر ظاہر کو قیاس کیا جائے ان میں فرق بیان کر دینے کے باعث یا اس کے مشابہ دوسری چیزیں"[۹]

مذکورہ دونوں خیالات کو سامنے رکھ کر اگر قدر مشترک نکالا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں ہی، نسخ کے معروف معنی کے بجائے اس کے لغوی اور عمومی معنی پر زور دیتے ہیں. گویا ان کے نزدیک نسخ ازالہ کا ہم معنی ہے۔

سورتوں کی ترتیب

قرآن کریم میں سورتوں کی آیات کی ترتیب کے بارے میں مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ منزل من اللہ ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہی اس کی موجودہ ترتیب ہے مگر سورتوں کی ترتیب کے بارے میں مفسرین ہم خیال نہیں ہیں گو کہ اکثر مفسرین آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب کو بھی توقیفی یعنی منزل من اللہ خیال کرتے ہیں مگر مفسرین کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اسے

توقیفی نہیں بلکہ اجتہادی تسلیم کرتا ہے ۔ اس طبقہ میں قاضی ابو بکرؒ، ایک قول کے مطابق یزید بن فارسؒ اور مالکؒ وغیرہ شامل ہیں[۵۴] ابن تیمیہؒ بھی دوسرے طبقہ میں شامل نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

"جہاں تک سورتوں کی آیات کی ترتیب کا سوال ہے تو وہ منزل منصوص علیہ ہے صحابہؓ کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ لکھنے میں کسی آیت کو کسی آیت پر مقدم کر دیتے جس طرح انھوں نے سورہ کو دوسری سورہ پر مقدم کیا، اس لئے کہ آیات کی ترتیب کا حکم نص سے ہے جب کہ سورتوں کی ترتیب اجتہاد سے وابستہ ہے"[۵۵]

اس کے ثبوت میں ابن تیمیہؒ نے دو دلیلیں دی ہیں ایک تو یہ کہ صحابہؓ کرام کے مصاحف میں سورتوں کی ترتیب مختلف تھی دوم یہ کہ امام احمد بن حنبلؒ سے سورتوں کے الٹ پلٹ کر دینے کے سلسلہ میں دو روایتیں منقول ہیں ایک تو یہ کہ مکروہ ہے کیونکہ مصحف عثمانی کے خلاف ہے دوم یہ کہ مکروہ بھی نہیں ہے جیسا کہ بچوں کی تعلیمی سہولت کے لئے کرتے ہیں کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے پہلے سورۃ البقرہ پھر سورۃ النسا، اور پھر سورہ آل عمران کی تلاوت فرمائی"[۵۶]

شاہ ولی اللہ بھی اسی رجحان کے حامل نظر آتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب اجتہادی ہے چنانچہ انھوں نے قرآن مجید کی مثال ان مکتوبات کے مجموعہ سے دی ہے جیسے کوئی بادشاہ حسب ضرورت اپنی رعایا کو یکے بعد دیگرے فرامین کے طور پر بھیجتا ہے اور جب بہت سے فرامین جمع ہو جاتے ہیں تو کوئی شخص ان کو جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کر دیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ہدایت کے لئے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حسب ضرورت قرآن مجید کی سورتیں نازل کیں ۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہر ایک سورہ جداگانہ طور پر مرتب اور محفوظ تھی، صرف آپ نے ان کو مدون نہیں فرمایا تھا، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں تمام سورتیں ایک جلد میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کی گئیں اور یہ مجموعہ مصحف کے نام سے موسوم ہوا"[۵۷]

شاہ صاحبؒ نے سورتوں کی تقسیم اور درجہ بندی کے اصول پر بھی روشنی ڈالی ہے اس کے مطابق صحابہؓ کے درمیان قرآن کی سورتیں چار قسموں پر منقسم تھیں:

(۱) طوال یعنی بڑی سورتیں

(۲) مئین، یعنی وہ سورتیں جن میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیات ہوں۔

(۳) مثانی، وہ سورتیں جن میں سو سے کم آیات ہوں۔

(۴) مفصل، یعنی آخر کی چھوٹی سورتیں۔

شاہ صاحبؒ نے سورتوں کی ترتیب پر گفتگو کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ:

"قرآن مجید کی ترتیب میں دو تین سورتیں جو مثانی کے قسم سے تھیں وہ مئین میں داخل کی گئیں اس لئے کہ ان کا سیاق مئین کے سیاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس بعض اقسام میں کسی قدر اور تصرف کیا گیا، حضرت عثمان نے اس مصحف کے مطابق چند نسخے لکھوا کر اطراف میں بھیج دیے تاکہ مسلمان اس سے استفادہ کریں اور کسی دوسری ترتیب کی طرف توجہ نہ کریں۔[۵۴]"

قرآن مجید میں کھائی گئیں قسمیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر قسمیں کھائی ہیں یہ قسمیں اپنی ذات اور صفات کے علاوہ بعض مخلوقات کی بھی ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قسم تو اپنے سے بڑی چیز کی کھائی جاتی ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جو شخص قسم کھائے، وہ اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے۔[۵۵]"

اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات وصفات کی قسم کھانا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اپنی مخلوق کی قسم کھانا اس کے شایانِ شان نہیں۔

اس سوال کا جواب ابن تیمیہؒ یہ دیتے ہیں اللہ نے جن مخلوقات کی قسم کھائی ہے وہ اس کی عظیم نشانیوں میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم کھاتا ہے، اپنی ذات مقدسہ اور صفات کی قسم کھاتا ہے، یا ان نشانیوں کی قسم کھاتا ہے جو اس کی ذات اور صفات کو مستلزم ہیں، جو قسمیں اس نے بعض مخلوقات کی کھائی ہیں وہ دلیل ہے اس بات کی وہ اس

کی عظیم نشانیوں میں سے ہیں[۵۶]

ابن تیمیہؒ کے اسی خیال کو ان کے شاگرد ابن قیم الجوزیہؒ نے دہرایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات کی قسم کھائی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مخلوقات اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ہیں[۵۷]

ابن تیمیہؒ کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہؒ کے یہاں قدرے وسعت پائی جاتی ہے وہ قرآن مجید کی ان قسموں کو جو مخلوق کی کھائی گئی ہیں عربی کلام کے اسلوب کا ایک رمز اور قرآنی پیرایہ بیان کا ایک حسن باور کرتے ہیں، وہ سورتوں کی مثال قصیدوں سے دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"چونکہ عرب کی مشہور فصاحت کا نمونہ قصائد ہیں اور وہ اپنے قصیدوں کے آغاز میں عجیب و غریب مقامات اور ہولناک واقعات کے ساتھ تشبیب کرتے تھے، اور یہ رسم زمانہ قدیم سے ان کے یہاں چلی آتی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعض سورتوں میں اس اسلوب کو اختیار کیا مثلاً: والصافات صفا فالزاجرات زجرا والذاریات ذروا فالحاملات وقرا فالجاریات یسرا۔[۵۸]

اسی کے ساتھ شاہ صاحب نے قرآن کی ایسی قسموں میں فی الجملہ عظمت اور دلیل کا پہلو تسلیم کیا ہے چنانچہ اپنی کتاب الخیر الکثیر میں وہ اسلوب قرآن کے تین حصے کرتے ہیں اول مقطع دوم حشو، سوم مقطع، مقطع کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس کے بھی متعدد اسالیب ہیں ایک تو یہ کہ بڑی نشانیوں کی قسم کھا کر سورہ کی ابتداء کرنا اور اس کا مقصد مقسم بہ کی جلالت شان کا اظہار اور عقل انسانی کو اس کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے ابتداء سورت میں ہولناک واقعات کا تذکرہ کرنا جس کو سن کر دل دہلنے لگتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ نصیحت کے لئے براءت استہلال کا درجہ رکھتی ہے، سوم یہ کہ عنوان کے انداز پر شروع کرنا جیسے لکھنے والا اپنے خط کے آغاز میں لکھتا ہے فلاں سے فلاں کو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کہتا ہے تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم ۰ چہارم حمد و تسبیح اور شکر کے کلمات کے ساتھ شروع کرنا جیسے خط میں لکھا جاتا ہے پنجم بغیر کسی عنوان

کے شروع کرنا جیسے اتی امر اللہ فلا تستعجلوہ"[۵۹]

اسرائیلی روایات

تفسیر میں سب سے پیچیدہ مسئلہ اسرائیلی روایات کا ہے، ان روایات کے سلسلہ میں اسلام کا اصولی موقف یہ ہے کہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موجب بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ سے روایت لینے میں کوئی حرج نہیں مگر نہ اس کی تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب[۶۰]، مفسرین قرآن نے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں اس اصولی موقف کو تسلیم کیا ہے۔ مگر بہت سے مفسروں نے عملاً اس میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے، اور اس کی وجہ سے ہمارے ذخیرہ تفاسیر میں رطب و یابس، کمزور اور ساقط الاعتبار ہر قسم کی روایات جمع ہو گئی ہیں جو کبھی کبھی قرآن کے مدعا اور مفہوم پر حجاب بن جاتی ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ اس معاملہ میں محتاط اور بیدار نظر آتے ہیں۔ وہ اسرائیلی روایات کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں ایک وہ جس کی صحت قرآن و سنت سے معلوم ہو چکی ہے اس لئے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں دوسری وہ جس کا جھوٹ ہونا واضح ہو چکا ہے اس لئے ہم اس کے باطل ہونے کے قائل ہیں۔ تیسری وہ روایات جن کے بارے میں ہماری ہدایت خاموش ہے ان کی نہ تو ہم تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب ان روایات کو استدلال کے لئے بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی اکثر روایات سے دین کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس کے بارے میں علماء بنی اسرائیل میں بھی اختلاف ہے اس کی وجہ سے مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً ایسی بحثوں میں کہ اصحاب کہف کا نام کیا تھا ان کے کتے کا رنگ کیا تھا، ان کی تعداد کیا تھی؟ اور ان چڑیوں کا نام کیا تھا جن کو اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے سوال پر زندہ کر دیا تھا وغیرہ[۶۱]

گویا ابن تیمیہؒ ان اسرائیلی روایات کو جن کی صحت و سقم معلوم نہ ہو استشہاد کے لئے، تو قابل قبول سمجھتے ہیں مگر اعتقاد کے لئے نہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس سلسلہ میں ابن تیمیہؒ سے بھی زیادہ حساس اور محتاط دکھائی دیتے ہیں وہ استشہاد یا اعتقاد کسی طور پر بھی اسرائیلیات کی روایت کو مناسب نہیں سمجھتے، مگر مجبوری کے وقت وہ اسے گوارا کر لیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ رسول کریم کے اس قول

"لاتصدقوا ولاتکذبوا" سے دو نتائج اخذ کرتے ہیں ایک تو یہ کہ کلام کا مفہوم جب قرآن و حدیث سے معلوم ہو جائے تو بنی اسرائیل سے نقل نہیں کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ ضروری چیز اپنی حد ضرورت تک ہی محدود رہنی چاہئے ۔ اس لئے اقتضا مفہوم کی مقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کرنا چاہیے تاکہ اس کی تصدیق قرآنی شہادت سے کر سکیں اور اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا چاہیے[۶۲]

شاہ صاحبؒ نے اس اصول کو اپنی فارسی تفسیر فتح الرحمٰن میں بھی اختیار کیا ہے ، وہ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "اسرائیلی قصے جو کہ علماء اہل کتاب سے منقول ہیں نہ کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس تفسیر میں داخل نہیں کئے گئے ہیں سوائے ان جگہوں کے جہاں ان کا ذکر کئے بغیر معنی کی وضاحت نہیں ہوتی اور ضرورت ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہے[۶۳]

باطنی تفسیر

اسلام میں ظاہر و باطن کی کوئی تفریق نہیں اس لئے ظاہر اور باطن کی تقسیم بھی اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ۔ ظاہر و باطن کی تفریق خاص دور اور مخصوص ذہنوں کی پیداوار ہے جس کی اشاعت باطنی فرقوں کے توسط سے ہوئی اور کسی حد تک صوفی رجحانات کے ذریعہ سے۔ قرآن کریم کی تفسیر بھی اس رجحان کے تحت کرنے کی سعی کی گئی ہے اور قرآنی الفاظ کے وہ معانی و مفاہیم بیان کئے گئے، جو تفسیر بالماثور کے برخلاف ہوں ۔ ان رجحانات کی حامل تفسیروں پر ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ دونوں نے گفتگو کی ہے ۔

ابن تیمیہؒ نے اولاً ظاہر و باطن کے مراد کو متعین کیا ہے پھر ان دونوں کا محاکمہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ باطن سے مراد اگر قلوب کی کیفیات وغیرہ کا علم ہے تو یہ اصول دین کا علم ہے اور اگر باطن سے مراد وہ علم ہے جو عام لوگوں پر مخفی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ علم ظاہر کے مخالف ہو اس صورت میں یہ باطل ہے اور اس کا دعویٰ کرنے والا ملحد و زندیق ہے یا گمراہ اور جاہل ہے ۔ دوسرے یہ کہ وہ علم ظاہر کے مخالف نہ ہو اس صورت میں کبھی یہ درست بھی ہو سکتا ہے اور کبھی باطل ۔ اگر وہ ظاہر کے مخالف نہ ہو اور معلوم ہو جائے کہ وہ حق ہے تو اسے قبول کر لیا جائے اور اگر یہ معلوم ہو کہ وہ باطل

ہے تو اسے رد کر دیا جائے، بصورت دیگر اس سے رکا جائے۔[۶۴]
ابن تیمیہ نے اس ضمن میں مختلف باطنی فرقوں مثلاً قرامطہ، اسماعلیہ، نصیریہ، صوفیا اور متکلمین وفلاسفہ کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی خامیوں اور گمراہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ پھر انھوں نے مذکورہ طبقات کی تفسیری کوششوں کا تنقیدی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ قرآن کے مدلول اور مفہوم کی یہ لوگ کس قدر غلط ترجمانی کرتے ہیں۔

بایں ہمہ ابن تیمیہ نے علم لدنی کا اعتراف کیا ہے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے وہ کہتے ہیں

"جہاں تک علم لدنی کا سوال ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے متقی دوستوں اور صالح بندوں کے دل کی پاکیزگی کی جو اس کے احکام کے سلسلہ میں ہو اور اس کی پسندیدہ چیزوں کا اتباع کرنے کی وجہ سے ان کے دلوں کو ان چیزوں کے لئے کھول دیتا ہے جو دوسروں کے لئے نہیں کھولتا"[۶۵]

ابن تیمیہ نے علم لدنی پر قرآن کریم کی حسب ذیل آیت سے استشہاد کیا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ	اور اگر وہ اس نصیحت پر عمل کرتے
بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ	تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتر اور ثابت
تَثْبِيْتًا وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ	قدمی کا موجب ہوتا اور تب ہم ان کو
لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا وَّلَهَدَيْنٰهُمْ	اپنی طرف سے بڑا اجر دیتے اور انھیں
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (النساء:)	سیدھا راستہ دکھاتے۔

شاہ ولی اللہ بھی باطنی تفسیروں کے سلسلہ میں فرق مراتب کا خیال رکھتے ہیں ایک طرف تو صوفیانہ تفسیری اقوال واشارات کے سلسلہ میں ان کی رائے یہ ہے کہ:

"درحقیقت وہ علم تفسیر کا جزو نہیں ہیں بلکہ قرآن شریف کے سننے کے وقت بعض باتیں سالک کے قلب پر ظاہر ہوتی ہیں جو نظم قرآن مجید اور اس حال سے جو سالک پر طاری ہوتا ہے یا اس معرفت سے جو اس کو حاصل ہوتی ہے، پیدا ہوتا ہے جس طرح کوئی لیلیٰ مجنوں کے قصہ کو پڑھتا ہے اور اپنی معشوقہ کو یاد کرتا ہے اور جو معاملہ اس کے اور معشوق کے درمیان گذرا ہوتا ہے اسے مستحضر کرتا ہے"[۶۶]

دوسری طرف وہ تفسیر کو خود ہی دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک اہل ظاہر کی تفسیر دوسری حکماء ربانیین کی تفسیر۔ وہ لکھتے ہیں کہ

تفسیر ظاہر کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو عربی زبان میں کامل دسترس حاصل ہو اور حدیث میں کافی دستگاہ ہو۔ اس سے اس کے اندر اتنا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مواقع کلام کو سمجھ سکے اور قرآن مجید کی آیات سے صحیح طریقہ پر استنباط کر سکے جو نہ تو اہل زبان کے محاوروں کے خلاف ہو اور نہ کوئی حدیث مرفوع اس کے خلاف ہو۔ تفسیر کی دوسری قسم ان حضرات کے حصہ میں آتی ہے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی کر کے حکمت اور عصمت و وجاہت کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کیا ہو، الٰہیات اور معادیات وغیرہ کے حقائق پر ان کا علم محیط ہو، قرآنی آیات کے مناط پر ان کی نظر ہو اور وہ اپنی تیز فہم و بصیرت سے ہر آیت کے متعلق یہ کہنے کے قابل ہوں کہ اس کا صدور کونسی بارگاہ سے ہوا ہے۔ قرآن مجید پر کامل ایمان رکھنے کی حقیقت یہی ہے اور تصدیق کا یہ منتہائے کمال ہے۔[۱۲۶]

گویا شاہ ولی اللہؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں ہی باطنی تفسیر اور صوفیانہ اشارات پر مشتمل تفسیر کو تسلیم نہیں کرتے مگر حکمت و معرفت پر مشتمل تفسیر کو دونوں تسلیم کرتے ہیں ایک علم لدنی کے نام سے اور دوسرے حکماء ربانیین کے تفسیر کے نام سے۔ اگرچہ ابن تیمیہ کے یہاں بھی تفسیر ظاہر کو معیار اور حجت قرار دیتے ہیں اور دوسری تفسیروں کو اس پر پرکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ علم لدنی کے سلسلہ میں اصول وضوابط کا کوئی تعین نہیں ہو سکتا اس لئے یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہ ہوگا کہ وہ کون سے لوگ ہیں جن کا دعوی علم لدنی درست اور دوسروں کا غلط ہے۔ اسی طرح حکماء ربانیین کی تفسیر کا معیار بھی مقرر کرنا مشکل ہوگا اور اگر وہ معیار ہو جو تفسیر بالماثور کا ہے تو ظاہری تفسیر سے اس کے امتیاز کی کوئی وجہ نہیں نیز یہ معلوم کرنا کہ فلاں آیت کا صدور کونسی بارگاہ سے ہوا ہے نہ تو علم تفسیر کا کوئی علمی نکتہ ہے اور قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس کی چنداں ضرورت ہے اور نہ ہی اس کو معلوم کرنے کا کوئی معتبر ذریعہ ہے۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ تفسیر کے باب میں اس کی گنجائش ہے۔

اختلاف رائے کی مثالیں

مناہج تفسیر میں اتفاق اور مماثلت کے مذکورہ پہلوؤں کے ساتھ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تفسیری کوششوں میں اختلاف رائے اور نقطہائے نظر کی عدم مماثلت کے بہت سے پہلو قابل مطالعہ ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم یہاں چند مثالوں پر اکتفا کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دونوں علما، اپنی مستقل فکر اور مکمل آگہی رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کا اعادہ نہیں ہے۔

سورۂ ہود کی آیت ۱۷ "أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ" کی تفسیر کرتے ہوئے ابن تیمیہؒ نے بینہ سے مراد علم نافع اور شاہد سے مراد عمل صالح لیا ہے[۶۸]۔ جب کہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک بینہ سے مراد دلیل عقلی ہے اور شاہد سے مراد قرآن کریم ہے[۶۹]۔

سورۂ یونس کی آیت ۶۶ "وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ" کا ترجمہ شاہ ولی اللہ اس طرح کرتے ہیں:

جو لوگ اللہ کے علاوہ شرکا، کی پیروی کرتے ہیں وہ درحقیقت پیروی نہیں کرتے مگر وہم کی اور وہ نہیں ہیں مگر جھوٹے"[۷۰] گویا حرف "ما" شاہ صاحبؒ کے نزدیک نفی کے لئے ہے مگر ابن تیمیہؒ اس کو غلط سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ ما نافیہ ہے حالانکہ یہ غلطی ہے، تو یہ استفہام کے لئے ہے ــــــ اگر یہ استفہام کے بجائے نفی کے لئے ہوتا تو یوں کہا جاتا ان یتبعون الا من لیس شرکاء حالانکہ یہ بیان کیا جارہا ہے کہ مشرکوں کے پاس علم نہیں ہے وہ تو گمان اور اٹکل ہے[۷۱]۔

سورہ ہود کی آیت ۱۰۸، "وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ" میں ابن تیمیہؒ کے نزدیک یہ آسمان و زمین جنت کے ہیں اور اس کے ثبوت میں انھوں نے بخاری و مسلم کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "جب تم اللہ سے جنت مانگو تو جنت فردوس مانگو کیونکہ اعلیٰ جنت ہے[۷۲]۔ مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہتے ہیں کہ "جنت و جہنم میں رہنے کی مدت دنیا میں آسمان و زمین کے رہنے کی مدت کے مانند ہوگی[۷۳]۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰، "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" میں لفظ خلیفہ شاہ ولی اللہؒ اور ابن تیمیہؒ دونوں کے نزدیک بڑی اہمیت کا

حامل ہے اور دونوں نے اس کی باہم مختلف بلکہ متضاد تفسیریں کی ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے نظریہ خلافت اور اس کے معانی و تقاضوں پر ازالۃ الخفا میں سیر حاصل بحث کی ہے وہ قرآن کی دوسری آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ" کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ تعالیٰ ان کو خلیفہ بنانے والا ہے اور یہ استخلاف اسی سے منسوب ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا اور لطیف لما یشاء ہے جس وقت دنیا کی اصلاح خلیفہ کے مقرر کرنے میں مضمر ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ امت کے دل میں الہام فرماتا ہے کہ حکمت الٰہی جس کو خلیفہ بنانے کی متقاضی ہے اسے خلیفہ بنائے"[۷۴] گو کہ شاہ صاحبؒ نے اس کی صراحت نہیں کی ہے مگر مذکورہ اقتباس اور فتح الرحمن کے ترجمے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب انسان کو خلیفۃ اللہ تسلیم کرتے ہیں مگر ابن تیمیہؒ کا موقف اس سلسلہ میں بہت سخت ہے وہ تو یہ کہتے ہیں کہ: فمن جعل له خليفة فهو مشرك به[۷۵] جو شخص کسی کو اللہ کا خلیفہ مانتا ہے وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے ابن تیمیہؒ کے اس سخت موقف کا پس منظر یہ ہے کہ حلولی، وجودی اور دیگر گمراہ فرقے یہ سمجھتے تھے کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے بایں طور کہ اللہ اس میں حلول کر گیا ہے ظاہر ہے کہ کفر صریح ہے جس کا قائل اہل سنت میں کوئی نہیں۔

سورہ ابراہیم کی آیت ۲۴ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ الخ کی تشریح ابن تیمیہؒ اس طرح کرتے ہیں "اصول ایمان کی جڑ مومن کے دل میں اس پاک درخت کی جڑ کی طرح ثابت ہے جس کی شاخیں آسمان میں"[۷۶]

شاہ ولی اللہ اس کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں "شریعت حق عالم ملکوت میں ثابت ہے اور دنیا میں اسے روزانہ تازگی ملتی ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں"[۷۷]

سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۸۰، وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا میں شاہ صاحبؒ کے نزدیک سلطان سے مراد "طاقت" ہے[۷۸] جب کہ ابن تیمیہؒ نے حجت اور علم کو ترجیح دی ہے[۷۹]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ دونوں کی تفسیری جد و جہد قرآن کے

طالب کے لئے مشعلِ راہ اور رہنما خطوط ہے دونوں کے نقطہائے نظر میں جزوی اختلاف کے باوجود بڑی مماثلت ملتی ہے اصولی طور پر اگر ابن تیمیہؒ فنِ تفسیر میں قرآن وسنت کے بعد صحابہ وتابعین کو حجت مانتے تو شاہ ولی اللہ بھی اس حد سے تجاوز نہیں کرتے مگر فن تفسیر میں دوسرے معاون علوم کی تطبیق وتشریح میں ابنِ تیمیہؒ اور شاہ صاحبؒ کے استدلال میں اختلاف کا ہونا ایک ناگزیر بات ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ کے اس قول سے صورت حال کو سمجھا جاسکتا ہے وہ کہتے ہیں "معانی و بیان وہ علم ہے جو صحابہؓ وتابعینؒ کے گذرنے کے بعد وجود میں آیا ہے تو جو کچھ جمہور عرب کے عرف میں سمجھا جاتا ہے وہ سر آنکھوں پر اور جو امر خفی ہے کہ اس فن کے ماہرین کی خبر سے بھی واضح نہیں ہوتا تو ہم نہیں تسلیم کرتے کہ یہ قرآن کا مطلوب ہے"[۵۹]

حوالہ جات

۱ محمد منظور نعمانی، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیم حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اکابر جماعت دیوبند کی نظر میں، ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ جمادی الاخریٰ ورجب ۱۳۹۲ھ

۲ خواجہ محمد امین کشمیری، مجموعہ کتاب مکتوب شاہ ولی اللہ، طابع سید احمد دہلی،

۳ ابن تیمیہ، تفسیر سورۃ النور، مجموع تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہ، مطابع الریاض، ص ۱۳۶

۴ اسماعیل بن کثیر، البدایہ والنہایۃ، دار الفکر العربی، بیروت، جلد ۱۳، ص ۳۴۳

۵ ابن عبد الہادی، العقود الدریۃ، مصر ص ۲۶ ۶ ایضاً

۷ محمد ابو زہرہ، ابن تیمیہ، حیاتہ وعصرہ آراوہ وفقہہ، دار الفکر العربی ۱۹۵۸ء، ص ۱۱، ۵۱۰

۸ ابن تیمیہ، مجموعہ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہ، بمبئی ۱۹۵۴ء ص ۱۰

۹ ابو الحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، لکھنؤ ۱۹۸۳ء جلد ۲، ص ۱۴۲،

۱۰ ابن تیمیہؒ وجہودہ فی التفسیر المکتب الاسلامی بیروت، ص ۸۴

۱۱ تاریخ دعوت وعزیمت ۲/۲۲۷ ۱۲ العقود الدریۃ، ص ۲۶

۱۳ ایضاً ص ۲۷ ۱۴ ابن تیمیہ حیاتہ وعصرہ، ص ۵۱۲

۱۵ ابن قیم الجوزیۃ، اسماء مولفات ابن تیمیہ تحقیق وتعلیق صلاح الدین المنجد، بیروت

۱۶؎ ابن تیمیہ حیاتہ، عصرہ۔

۱۷؎ شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، مطبع محمدی دہلی، ص ۶۰

۱۸؎ عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۹۱

۱۹؎ تفصیل کے لیے، دیکھیے راقم کی کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ، نئی دہلی ۱۹۹۳ء

۲۰؎ ابن تیمیہ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ، مکتبۃ المعارف المغرب جلد ۱۳، ص ۳۳۲

۲۱؎ شاہ ولی اللہ، فتح الرحمن، مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۳ھ، مقدمہ

۲۲؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۶۴، ۳۶۳ ۲۳؎ ایضاً ص ۳۴۳ ۲۴؎ ایضاً ص ۵۹، ص ۳۵۴

۲۵؎ ابن تیمیہ، مقدمہ فی اصول التفسیر، قاہرہ ۱۳۹۷ھ ص ۲۷ ۲۶؎ الفوز الکبیر، ص ۶۶

۲۷؎ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، مطبع رشیدیہ، دہلی، جلد ۱، ص ۱۷۱ ۲۸؎ الفوز الکبیر، ص ۲۵

۲۹؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۲۹۳ ۳۰؎ ابن تیمیہ بیان موافقۃ صریح المعقول بصحیح المنقول، علی ہامش منہاج السنۃ، بولاق ۱۳۲۱ھ جلد ۱، ص ۱۱۵ ۳۱؎ ایضاً، ص ۱۰

۳۲؎ ابن تیمیہ، مجموعۃ الرسائل الکبری، دار الفکر ۱۹۸۰ء، جلد ۲، ص ۳۶ ۳۳؎ الفوز الکبیر، ص ۶۹

۳۴؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۲۹۱ ۳۵؎ الفوز الکبیر، ص ۵۹

۳۶؎ ابن تیمیہ، الرسائل والمسائل، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۳ء، ص ۸۷-۸۱

۳۷؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۲۲۹ ۳۸؎ ایضاً، ص ۳۴۰ ۳۹؎ الفوز الکبیر ص ۳۱

۴۰؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۲۸۴ ۴۱؎ ایضاً، ص ۱۴۳-۴۴ ۴۲؎ ابن تیمیہ تفسیر سورۃ الاخلاص، مطبع حسینیہ مصریہ ۱۳۲۳ھ ص ۸۱ ۴۳؎ رشید رضا، تفسیر المنار، مصر ۱۳۲۵ھ جلد ۲، ص ۱۷۲

۴۴؎ فتح الرحمن، سورہ آل عمران: ۷ ۴۵؎ ایضاً ۴۶؎ حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۱۷۱

۴۷؎ الفوز الکبیر، ص ۶۶ ۴۸؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۳۰-۲۹

۴۹؎ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص ۲۶ ۵۰؎ جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، دار الندوۃ الجدیدۃ بیروت، جلد ۱ ص ۶۲ ۵۱؎ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۳۹۶

۵۲؎ ایضاً ص ۱۴۰ ۵۳؎ الفوز الکبیر، ص ۶۱ ۵۴؎ ایضاً

۵۵؎ محمد اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الایمان والنذر، باب لا تحلفوا بآبائکم

۵۶ مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۳۱۴

۵۷ حمید الدین فراہی، اقسام القرآن، ترجمہ امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ ص۸۱

۵۸ الفوز الکبیر، ص ۴۹ ۵۹ شاہ ولی اللہ، الخیر الکثیر، قرآنی محل کراچی، ص ۲۸۶-۲۸۵

۶۰ الجامع الصحیح، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل

۶۱ مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۳۶۶ ۶۲ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۶۲

۶۳ فتح الرحمٰن، مقدمہ ۶۴ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۲۳۶-۲۳۰

۶۵ ایضا، ص ۲۴۵ ۶۶ الفوز الکبیر، ص ۶۷ ۶۷ الخیر الکثیر، ص ۲۸۴-۲۸۳

۶۸ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۵/ ۶۲ ۶۹ فتح الرحمٰن، حاشیہ سورہ ہود: ۱۷۰

۷۰ ایضاً سورہ یونس: ۶۶ ۷۱ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۵/ ۶۱ ۷۲ ایضاً ص ۱۰۹

۷۳ فتح الرحمٰن، حاشیہ سورہ ہود آیت: ۱۰۸ ۷۴ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، مطبع صدیقی بریلی، جلد ۱ ص ۱۹

۷۵ مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۳۵/ ۵۴

۷۶ ایضا، ۱۳/ ۱۵۸ ۷۷ فتح الرحمٰن، سورۃ ابراہیم آیت: ۲۴

۷۸ ایضاً سورۂ بنی اسرائیل: ۸۰ ۷۹ مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ۱۳/ ۱۲

۸۰ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۶۷

مطبوعاتِ ادارہ علوم القرآن

• قرآنی مقالات — دائرہ حمیدیہ/ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ترجمان "الاصلاح" کے منتخب مقالات کا مجموعہ جو اشعری حوالوں کے ساتھ جدید انداز میں اصول تفسیر، نظم قرآن، اور دوسرے اہم مباحث پر تحقیقاتی مضامین کا نادر مجموعہ

صفحات: ۳۲۰، قیمت عام ایڈیشن: =/۶۰، لائبریری ایڈیشن: =/۹۵

• حقیقتِ نماز — مولانا امین احسن اصلاحی
نماز کے موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی کی مختصر لیکن نہایت قیمتی اور اہم کتاب
صفحات: ۶۰، قیمت: =/۵ روپے

• کتابیاتِ فراہیؒ — ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی — قیمت: ۱۵ روپے
مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی کی مطبوعات (کتب و مضامین) کے بارے میں ببلوگرافی کے جدید اصول کے مطابق مفید معلومات
مولانا فراہی کی شخصیت، افکار و علمی خدمات پر مطبوعہ مواد کے مکمل حوالے
ان کی نگارشات پر اہل علم کے تبصروں و تقاریظ کی نشاندہی
کمپیوٹر کتابت میں معیاری کتابت اور آفسیٹ کی عمدہ طباعت سے مزین
اداروں، کتب خانوں اور تاجروں کے لیے خصوصی رعایت

ملنے کے پتے
ادارہ علوم القرآن پوسٹ بکس نمبر ۹۹ سرسید نگر علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲
مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳ چتلی قبر دہلی ۱۱۰۰۰۶